انجمن ترقی اردو ہند

کا

ہفتہ وار اخبار

قیمت سالانہ
تین روپیہ
ایک پرچہ
تین آنہ
تاریخ اشاعت
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

رجسٹرڈ نمبر
اے ۹۲۲
ٹیلیفون نمبر ۲۹
تار کا پتہ
"انجمن"
علی گڑھ

ہماری زبان

ایڈیٹر :- آل احمد سرور

جلد ۱۵	علیگڑھ - ۱۰ جنوری ۱۹۵۷ ع	شمارہ ۲۹

رفتار

خلیل الرحمٰن اعظمی

اردو میں مختصر افسانہ نگاری سے متعلق آج کل عام طور پر ایک سرد سا رویہ ملے گا۔ ہمارے تنقید نگار عام طور پر شاعری کے تنقید نگار ہو کر رہ گئے ہیں یا پھر تنقید کی تنقید لکھی جا رہی ہے۔ اس مسئلے پر اگر بات چیت کے دوران میں کچھ کرید کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ اس سوال کو ٹالنے کی کوشش کر رہے ہیں، بہت اصرار کیجئے تو جواب ملے گا کہ ابھی افسانہ نگاری کا کچھ ایسا زور نہیں اس لئے بظاہر اس کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ان دنوں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ رسالے پڑھتے وقت تنقید اور شعر کا حصہ تو دلچسپی سے پڑھتے ہیں لیکن افسانوی حصے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ جیسے افسانہ پڑھنا تضیع اوقات ہے۔ اسی لئے نئی پود کے افسانہ نگاروں کے بارے میں وہ کھل کر کوئی رائے دے بھی نہیں سکتے۔ مستقبل کی طرف سے مایوسی کا جو اظہار ان کی طرف سے ہوتا ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہمارے اکثر پرانے لکھنے والے یا تو افسانہ نگاری ترک کر چکے ہیں یا روبہ انحطاط ہیں۔ اور یہ کہ ادبی کتابیں چھاپنے والے پبلشر آج کل مختصر افسانوں کے مجموعے بہت کم چھاپ رہے ہیں۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو اس بات کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں تک عام پڑھنے والوں اور کتابیں خریدنے والوں کا تعلق ہے ان کی دلچسپی افسانوی ادب سے کم نہیں ہوئی ہے یہ ضرور ہے کہ وہ۔ اب معیاری اور ادبی افسانے پڑھنے کے بجائے جاسوسی افسانے اور عریاں و فحش کہانیوں پر ٹوٹتے ہیں جہاں تک کتابیں خریدنے اور پڑھنے والوں کی عام آبادی کا تعلق ہے اگر اس کی مردم شماری پر ادب کی ترقی یا انحطاط کا اندازہ لگایا جائے تو تقسیم سے قبل جب ہمارے یہاں معیاری ادبی افسانے کی کتابیں بہت مقبول تھیں اور کرشن چندر، منٹو، عصمت اور ممتاز مفتی کے افسانے بہت پڑھے جاتے تھے اس دور میں بھی ان سے زیادہ مقبولیت ایم، اسلم تیرتھ رام فیروزپوری اور رئیس احمد جعفری وغیرہ کو حاصل تھی اور جو خداداد کر ادیبوں نے اپنی کتابوں سے جتنا معاوضہ اپنے ناشروں سے وصول کیا ہوگا ہمارے ادبی اہمیت رکھنے والے افسانہ نگاروں کو اس کا عشر عشیر بھی نہ ملا ہوگا۔ پھر اس زمانے میں بھی اگر آپ غور سے کام لیں تو یہ اندازہ ہوگا کہ کرشن چندر، منٹو، عصمت اور ممتاز مفتی سے کم بکنے والی کتابیں بیدی، غلام عباس اور حیات اللہ انصاری کی تھیں۔ پہلے گروہ کے افسانہ نگاروں کی کتابیں تو عام آدمی بھی پڑھ لیتے تھے لیکن بیدی وغیرہ کی کہانیاں عام آدمیوں کو کچھ خشک معلوم ہوتی رہیں اس لئے لامحالہ صرف ادبی شعور رکھنے والے ان کہانیوں کو پڑھتے اور سراہتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تقسیم سے قبل ہماری مختصر افسانہ نگاری جو ادبی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا غالب رجحان بھی سنسنی خیزی اور جنسی لذت کی طرف تھا۔ وہ سنسنی چاہے سیاست اور انقلاب سے پیدا کی جائے یا فحاشی اور نفسیاتی الجھنوں سے۔ تقسیم کے بعد کچھ دنوں کے لئے اس سنسنی کا مرکز فسادات کا موضوع بن گیا اس لئے اس زمانے کی مقبول ترین کتابیں "ہم وحشی ہیں" اور "سیاہ حاشیے" ہیں لیکن جوں جوں انتشار اور بے چینی ختم ہوتی گئی اور تعمیری دور کے آغاز کے ساتھ لوگوں کی تحریروں میں ضبط و توازن اور غور و فکر کے عناصر راہ پانے لگے تو ہماری افسانہ نگاری سے تفریحی پڑھنے والوں کا طبقہ آہستہ آہستہ رشتہ توڑنے لگا اور ہمارے پبلشر بھی ان افسانہ نگاروں سے آنکھیں پھیرنے لگے۔ لیکن بازار مندا ہو جانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ

سنجیدہ پڑھنے والے بھی افسانہ نگاری کو طلاق دے دیں۔ سنجیدہ پڑھنے والے اگر تحقیقی اور علمی کتابوں کی خشکی کو گوارا کر لیتے ہیں تو کیا ہمارا افسانہ ایسا گیا گزرا ہے کہ ان کو بالکل ہی روکھا پھیکا نظر آئے۔ میرا خیال ہے اس مسئلے پر ہم سب کو غور کر کے اپنے ذہنوں کا تجزیہ کرنا چاہئے

تقسیم کے بعد افسانہ نگاروں کی جو نئی پود پیدا ہوئی ہے اس میں سب سے زیادہ اے۔ حمید کی کتابیں پڑھی گئی ہیں۔ ان کے افسانوں میں رومانیت غالب ہے اسی لئے غالباً عام پڑھنے والوں کو اس میں لذت کا عنصر مل جاتا ہے لیکن جن لوگوں نے اے۔ حمید کے دوسرے ہم عصروں کی کہانیاں بھی پڑھی ہیں ان سے پوچھا جائے تو ہر شخص یہی کہے گا کہ اس نسل میں صحیح معنوں میں بلند پایہ افسانے جن افسانہ نگاروں نے دئے ہیں ان میں اشفاق احمد، شوکت صدیقی، اور انتظار حسین ہیں۔ ان لوگوں کے تو ایک آدھ مجموعے چھپے بھی ہیں لیکن کئی اچھے لکھنے والے ایسے ہیں جن کی کہانیاں ابھی صرف رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ ایسے افسانہ نگاروں میں ضمیرالدین احمد، سید خلیل احمد، ابن الحسن، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، جاوید جعفری، امجد الطاف، شام ملک، عوض سعید، غلام علی چودھری اور صادق حسین کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اب ان لکھنے والوں کی چھان بین کیجئے اور کچھ افسانے رسالوں سے تلاش کر کے پڑھ ڈالئے۔

شوکت صدیقی کا "تیسرا آدمی" "تانتیا" اور "غم دل اگر نہ ہوتا" تو پہلے ہی مشہور ہو چکے ہیں اب ان کے نئے افسانے "اندھیرا اور اندھیرا"، "مردہ گھر"، "شریف آدمی"، "چور دروازہ"، "خدا داد کالونی"، "تیلہ جی اور کوکا بیلی" اور "پڑھ لیجئے"۔ اشفاق احمد کا "گڈریا" نقوش کے افسانہ نمبر میں چھپ چکا ہے اور ۱۹۵۴ء کے بہترین ادب (مکتبہ اردو) میں بھی آ چکا ہے۔ انتظار حسین کا ایک مجموعہ "گلی کوچے" پہلے چھپ چکا ہے "کنکری" ابھی حال ہی میں مکتبہ جدید نے شائع کیا ہے۔ ان کے افسانے "آخری موم بتی" اور "اجودھیا" کئی انتخابات میں بھی آ چکے ہیں۔ ضمیرالدین احمد کے افسانے "رگ سنگ"، "بہتا خون ابلتا خون"، "چاندنی اور اندھیرا"، "پکا گانا"، "کھوئی ہوئی منزل"، "کچھ عجیب سا" اور "گڑیا" نقوش، ساقی اور نیا دور وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ سید خلیل احمد کے افسانے "مالک"، "شمع بجھتی ہے تو" اور "سفید آنا" نقوش اور ادب لطیف میں چھپ چکے ہیں۔ ابن الحسن کا "فٹ پاتھ"، جیلانی بانو کا "نئی عورت"، "موم کی مریم" اور "مجبور اور چراغ"، واجدہ تبسم کا "تین جنازے" اور "گلستاں سے قبرستان تک"، جاوید جعفری کا "بخشے پاک پروردگار"، شام ملک کا "ڈرام"، عوض سعید کا "بیدی صاحب" اور "نانی اماں"، امجد الطاف کا "چوتے کی کھیا"، صادق حسین کا "شعلوں کے سامنے ہیں" اور غلام علی چودھری کا "لنگڑا لال" اور "اینٹوں کا چہرہ" یہ سارے افسانے نقوش، ادب لطیف، ادبی دنیا، نئی تحریریں، شاہراہ، سویرا، نیرنگ و ادب لطیف وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

ان سارے نئے افسانوں کو اگر غور سے پڑھا جائے تو ایک بے درد سے بے درد نقاد بھی اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ افسانے ہر اعتبار سے معیاری ہیں اور ہمارے ادب میں قابل قدر اضافہ۔ البتہ یہ اندازہ بھی ہوگا کہ غور و فکر، مشاہدہ، بے لاگ حقیقت نگاری، اور فنی سوجھ بوجھ کا عنصر ہمارے لکھنے والوں میں اب کچھ زیادہ ہی بڑھ رہا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب ہمارے لکھنے والے صرف ایک ہی موضوع کے گرد نہیں گھوم رہے ہیں بلکہ ہر ایک نے اپنے ماحول اور اپنی شخصیت کے اعتبار سے صرف انہیں مسائل کو برتنے کی کوشش کی ہے جو اس کے فنی ادراک کا جزو بن چکے ہیں۔ اس لئے ان افسانہ نگاروں کی کہانیوں پر مغرب کے کسی افسانہ نگار کے چربے یا نقل کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ (حال ہی میں کچھ لوگوں نے تحقیق کی ہے کہ منٹو اور کرشن چندر کی بہت سی کہانیاں فرانس اور انگلستان کے افسانہ نگاروں کی اڑائی ہوئی ہیں)۔ اب اگر افسانہ نگاروں کی نئی پود نے تیس چالیس کی تعداد میں بھی ایسے افسانے ہمارے ادب کو دے دئے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا افسانہ زندہ بھی ہے اور اس میں گہرائی بھی آتی جا رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے یہاں کے عام لوگ اب بھی رئیس احمد جعفری، رشید اختر ندوی، نسیم حجازی اور دت بھارتی پر لوٹیں اور کتابوں کے پبلشر انہیں مقبول ترین لکھنے والوں سے محبت کریں۔ اس فضا کو بدلنے کے لئے ابھی ہمیں بہت ترقی کرنی ہے۔ ابھی تو ہمارے اچھے لکھنے والوں کو کچھ دن یہی شکوہ رہے گا کہ بیکار ادب کے جنجال میں پھنسے اس سے زیادہ نفع تو کرم کلّے کی کاشت میں ہے"

ہماری زبان

۱۵ جنوری ۱۹۵۷ء

ادیب اور آزادی

ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں ادیب اور آزادی کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا تھا اور جیسی کہ توقع تھی اس معرکے پر خوب طبع آزمائی کی گئی۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ ادیب کو مکمل آزادی ہونی چاہیے۔ وہ جو چاہے لکھے، کسی سماج کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس پر پابندی عائد کرے۔ دوسرا گروہ کہتا تھا کہ ادیب کو سماج کے خلاف کچھ نہ لکھنا چاہیے۔ تیسرا گروہ صرف جمالیاتی تقاضوں کو ضروری سمجھتا تھا اور کسی پابندی کا قائل نہیں تھا۔ اس بحث میں سیاسی گروہ بندی کا عکس بھی شامل ہو گیا تھا۔ یعنی کچھ لوگ کہتے تھے کہ صرف سوشلسٹ سماج ہی میں ادیب کو مکمل آزادی میسر آ سکتی ہے اور کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اشتراکی حکومتوں میں ادیب کو حقیقی آزادی حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ یعنی کثرت تعبیر سے خواب کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔

ادیب اور آزادی کا مجرد تصور آسان ہے۔ مگر اس کی مکمل تصویر آسان نہیں۔ ادب بہرحال زندگی کی تخیلی ترجمانی ہے۔ یہ صرف تخیل کی ساحری یا حقیقت کی بے شعور عکاسی نہیں۔ ادیب اپنے تخیل کی شمع سے ان حقائق کو روشن کرتا ہے جو عام نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ وہ عام حقائق کو الٹ پلٹ کر کے لوگوں کو بصیرت عطا کرتا ہے۔ وہ اپنے خوابوں کے ذریعے سے بالآخر حقائق کی توسیع کرتا ہے۔ اگر آپ ادیب کے ذہن پر پابندی عائد کرنا چاہیں، اسے ایک خاص راستے پر چلنے پر مجبور کر دیں، اس کے سامنے ممنوعات کی ایک دیوار کھڑی کر دیں تو اس کی تخلیقات بے جان ہو جائیں گی۔ زندگی کی پڑیاں ہی اسے ادب میں خوابوں کا رنگ محل بنانے کی دعوت دیتی ہیں۔ اگر اس کی زبان پر تالا یا اس کے قلم پر مہر ہو تو یا تو وہ بجھ کر رہ جائے گا یا ان پابندیوں کے خلاف بغاوت کرے گا۔ اس لئے ادیب کے لئے آزادی اتنی ہی ضروری ہے جتنی زندگی کے لئے تازہ ہوا یا گرمی یا سورج کی روشنی۔ اس کا ذہن غلام نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا خیال پابہ زنجیر نہیں ہونا چاہیے۔ ادیب قوم کا ضمیر ہوتا ہے جب تک ضمیر کی یہ آواز اپنا کام کر رہی ہے قوم کو کوئی ذہنی خطرہ نہیں ہے۔ جب یہ آواز بند ہو جائے تو قوم کی ذہنی موت واقع ہو گئی ہے۔ ادیب گو ایک سماج کا فرد ہے۔ مگر سماج کے دوسرے افراد سے زیادہ، سماج کی فلاح کی خاطر اسے قوم اور حکومت پر نکتہ چینی کا حق حاصل ہے۔ اگر کوئی سماج ادیب کو حکومت پر نکتہ چینی کا حق نہیں دیتا تو وہ ادیب کے منصب کا پاس نہیں رکھ سکتا۔ سوشلسٹ حکومتوں میں جہاں کہیں ادیب پر احتساب ہوا ہے اس کا نتیجہ ادب کے حق میں اچھا نہیں نکلا۔ ادب صحافت یا سرکاری دستاویز یا واقعات کی کھتونی بن گیا۔

چنانچہ آزادی ادیب کا حق ہے اور کوئی اچھا اور باشعور سماج اسے اس آزادی سے محروم نہیں کر سکتا۔ مگر آزادی کی بھی پابندیاں ہوتی ہیں۔ آزاد رہنے کے بھی شرائط ہوتے ہیں۔ آزادی کے نام پر انفرادیت پرستی یا سماج دشمنی یا مریض ذہن کی عکاسی ادیب کو زیب نہیں دیتی۔ جب سماج کا شکنجہ بہت سخت ہو تو ادیب کو حق پہنچتا ہے کہ وہ فرد کی آزادی پر اصرار کرے۔ جب سماج کی بنیاد غیر منصفانہ ہو تو وہ اسے بدلنے کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ جب بدہضمی کو صحت کی علامت سمجھا جائے تو وہ فصد کھلوانے کا مشورہ دے سکتا ہے۔ جب کٹرپن، روایت پرستی، یا اقتدار پرستی، افراد کی زندگی پر پیر تسمہ پا کی طرح مسلط ہو تو ادیب کا فرض ہے کہ اس کے خلاف آواز بلند کرے۔ مگر ادیب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے بلند منصب سے فائدہ اٹھا کر سماجی زندگی کی بنیادیں ہلا دے اجتماعی روح کو کچل دے، اشتراک باہمی اور تعاون کے تقاضے کو توڑ پھوڑ دے۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ سماجی خیر کیا ہے، ذہنی صحت کسے کہتے ہیں۔ فرد کی آزادی کس حد تک سماج کے لئے مفید ہے اور کہاں مضر ہو جاتی ہے۔ کیا ادیب کی آزادی کا بھی کوئی چارٹر مرتب کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مسائل کا دو اور دو چار کی طرح کوئی فارمولا نہیں بنایا جا سکتا۔ کوئی ایسا مقیاس الادب ممکن نہیں ہے جو ابد تک کام دے۔ ادب سائنس نہیں ہے جس میں ایک قانون دوسرے قانون کی جگہ لے لیتا ہے۔ یہاں ایک صداقت دوسری کی لاش پر قائم ہوتی ہے۔ ادب کے میدان توسیع ہوتی رہتی ہے اسی وجہ سے سماجی خیر، ذہنی صحت، فرد کی آزادی کی حد کا تعین بھی وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جو اس وادی کے مرد میدان ہیں، جنہیں سالک راہ طریقت کہا جا سکتا ہے۔ "سوچن کے جہاں" کی طرح ادیب کے جہان کی بھی حد نہیں ہے، سوائے ان حدود کے جو اس کا سماجی اور جمالیاتی شعور اس پر عائد کر دے۔ افلاطون کی حکما کی حکومت یا برنارڈ شا کے مرد دانا کی حکومت کی طرح، ادیبوں

کی حکومت قائم کرنا ہمارا مقصد نہیں۔ ہاں حکومتوں میں ادیب کو فرد کو نہیں اس کے منصب کا احترام کرنے کا جذبہ پیدا کرنا مقصود ہے۔ ادیب سیاسی تصور کی خاطر، اس کی کسی مخصوص تحریک پر بھی معترض ہو سکتا ہے۔ اچھا سماج کبھی اسے اس مقدس کام سے روکنے کی کوشش نہیں کرے گا اور جب تک یہ اچھا سماج موجود نہیں ہے، ادیب کا کام برابر جاری رہے گا۔

جن سنگھ اور اردو

پنجاب کی ایک اطلاع ہے کہ جن سنگھ نے اپنے انتخابی منشور میں اردو کو ایک فرقہ پرست زبان بتایا ہے اور یہ بشارت بھی دی ہے کہ جب اس کی حکومت ہوگی تو وہ اردو سے اس ملک کو پاک کر دے گی۔ ہمیں اس پر فارسی کا ایک مشہور شعر یاد آیا ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

زبانوں کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ کوئی ذات، نہ کوئی فرقہ۔ اردو نہ کسی ایک مذہب کی زبان ہے، نہ کسی ایک فرقے کی ملکیت۔ جن سنگھ کی اطلاع کے لئے ہم صرف یہ کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ اس زبان کو ہر مذہب کے لوگوں نے اپنی تبلیغ اور پرچار کے لئے استعمال کیا ہے۔ آریہ سماج کی بھی بیشتر کتابیں اردو میں موجود ہیں۔ حقایق کا خون کر کے اور نفرت کے جذبات بھڑکا کر کچھ دن تک لوگ ملک کی ترقی میں روڑے اٹکا سکتے ہیں مگر بالآخر انھیں وقت کے بہاؤ کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ انتخابات کا جادو بھی عجیب ہے کہ چند ووٹوں کی خاطر پارٹیاں کیسی کیسی قلم بندی کرتی ہیں۔

رہی یہ بشارت کہ جن سنگھ کی حکومت آئی تو اردو کا خاتمہ ہو جائے گا اس کے متعلق بھی اردو کا یہ مشہور شعر کافی ہے ؎

خدا تا جب نادان دراز سن تو کرے
ہو تو بھی جور کے قابل خدا وہ دن تو کرے

روس میں ہندستانی زبانیں

اپنے قیام کے پچیس سالہ عرصے میں غیر زبانوں کی لغات کے اشاعت گھر نے دنیا کی بالکل مختلف زبانوں کی کوئی پانچ سو فرہنگیں شائع کی ہیں۔

ہندستانی زبانوں کی فرہنگوں کے پہلے ایڈیشن کا کام دوسری جنگ عظیم سے قبل شروع کیا گیا تھا۔ لیکن جنگ کی وجہ سے یہ کام درمیان میں رہ گیا۔ پھر ۱۹۵۱ء جاکر ایک اردو روسی لغت اور ۱۹۵۳ء میں ہندی روسی لغت شائع کی گئی۔ ان دونوں کا سہرا مشہور و معروف روسی ماہر علم ہند اکادیمیشین برانی کوف کے سر ہے۔ ہر لغت روزمرہ استعمال کے تقریباً تیس ہزار معاشرتی اور سیاسی الفاظ پر مشتمل ہے اور عوام نے ان دونوں کو بیحد پسند کیا ہے۔

ہندستان اور سوویت یونین کے بڑھتے ہوئے تعلقات نے سوویت عوام نے ہندستان، معاشیات، پالیسی اور تہذیب سے گہری دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ ہندی، اردو، پنجابی، مراٹھی، تامل، تلگو اور ہندستان کی دیگر مروجہ زبانوں میں مہارت رکھنے والے افراد کی تعداد سوویت یونین میں روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اسکولوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے طالب علم ہندستان کے جغرافیے اور اس کی معاشیات، تہذیب اور تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ امسال ماسکو میں ایک بورڈنگ اسکول قائم کیا گیا ہے۔ جہاں روایتاً یورپ کی زبانوں کے بجائے طالب علم دوسری جماعت سے ہندی، اردو اور چینی زبانوں کی تعلیم حاصل کیا کریں گے۔ سوویت یونین میں جس طرح رابندرناتھ ٹیگور، پریم چند، کرشن چندر، ملک راج آنند اور دوسرے ہندستانی ادیبوں کے مداحوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بالکل اسی طرح ہندستانی مصنفوں کی ——— کتابوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ قدرتی طور پر سوویت یونین کا ہر وہ فرد جو کسی بھی ہندستانی زبان کی واقفیت رکھتا ہے اپنے پسندیدہ مصنف کی اصل تخلیقات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس لئے ہر نئی لغت کی اشاعت ملک کی تہذیبی زندگی میں ایک عظیم اور مسرت انگیز واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اب سوویت یونین میں ہندستانی فرہنگوں کی اشاعت کو بہتر کرنے کے لئے عملی اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ غیر زبانوں کی لغات کے دارالاشاعت میں جنوب مشرقی ایشیائی زبانوں میں شائع کی جانے والی لغتوں سے متعلق ایک خصوصی دفتر ادارت قائم کیا گیا ہے۔ اس دفتر کا پلان ۱۹۵۷ء میں ۵۰ ہزار الفاظ پر مشتمل ایک روسی اردو لغت شائع کرنے کا ہے۔ اس وقت مرتبوں کا ایک گروہ اس لغت کی تیاری میں لگا ہوا ہے لیکن اس سے بھی پہلے ایک ہندی روسی فرہنگ ماہرین لسانیات کے پاس پہنچ جائے گی۔ مشہور فرہنگ نویس لیسکروونی اسکو ترتیب دے رہے ہیں بنگالی*

* روسی لغت اگلے سال منظر عام پر آجائے گی۔ اس میں معاشرتی، سیاسی، فنی اور روزمرہ استعمال میں آنے والے تقریباً ۳۰ ہزار الفاظ ہوں گے ایک عظیم الشان اردو روسی لغت کی ترتیب کا کام شروع کیا جا چکا ہے جو پچاس ساٹھ ہزار الفاظ پر مشتمل ہوگی ایسے محاورے ترجمے میں یہ لغت نہایت مفید ثابت ہوگی جو غیر معمولی طور پر مشکل ہوتے ہیں ——— روسی ہندی اور روسی اردو زبانوں کی لغات کی تیاری میں جدید ہندستانی مصنفوں کی تصانیف اور رسالوں، اخباروں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

انجمن کی خبریں

نان پارہ (بہرائچ)

نان پارہ (ذریعہ ڈاک) یہاں انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ ڈاکٹر طاہر علی بیگ کی صدارت میں ہوا۔ ممبران مجلس عاملہ کے علاوہ شہر کے ممتاز اشخاص نے جلسے میں شرکت کی۔

جلسہ میں پچھلی تجاویز کا جائزہ لیا گیا اور پرائمری درجات میں اردو تعلیم جاری کرانے کے لئے انجمن کی کوششوں پر اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ اور ایک " اردو کانفرنس اور آل انڈیا مشاعرہ " منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے لئے ایک سب کمیٹی صدر صاحب کی قیادت میں بنا دی گئی۔ اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی رپورٹ جلد دے گی۔

یہاں جنتا جونیر ہائی اسکول کی " مینیجنگ کمیٹی " کا ایک جلسہ ہوا جس کا سلسلہ تقریباً ۳ گھنٹہ جاری رہا۔ جلسے میں مقامی ممبران کے علاوہ باہر کے ممبروں میں ضلع کے مشہور کانگریسی لیڈر شری مدن لال ایم۔ ایل۔ اے اور سید محمود حسن نے شرکت کی۔

بمبئی

۲۸ دسمبر۔ انجمن ترقی اردو شاخ بمبئی کے زیر اہتمام صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ میں ایک انٹر اسکولز اردو انعامی تقریری مقابلہ ہوا جس میں بمبئی کے ۱۰ اسکولوں کے ۱۶ طلباء اور طالبات نے حصہ لیا اردو کی مشہور افسانہ نگار خاتون عصمت چغتائی نے صدارت فرمائی۔

طلبا نے " اردو ادب اور وقت کے تقاضے " " طلبا اور سیاست " اور " اگر میں وزیر تعلیم بن جاؤں " کے عنوان سے تقریریں کیں۔

آخر میں انجمن کے جنرل سکریٹری من موہن کالیہ صاحب نے انجمن کے اغراض و مقاصد اور کارروائیوں پر روشنی ڈالی۔

صدر صاحبہ نے تقریر کے دوران میں اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے انجمن کو اس کی کارروائیوں پر مبارکباد دی۔

اس کے بعد انعامات تقسیم کئے گئے اور عصرانہ دیا گیا۔

بنارس

۵ جنوری۔ انجمن ترقی اردو شاخ بنارس کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ ۵ جنوری کو بابو کرشن موہن صاحب کی زیر صدارت ہوا۔ اس جلسے میں بنارس میں ریجنل کانفرنس کرنے کی تجویز منظور ہوئی اور یہ طے ہوا کہ یہ کانفرنس ۹، ۱۰ جنوری کو کی جائے۔ کانفرنس کے سلسلے میں حسب ذیل حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی گئی۔

بابو کرشن موہن۔ وانا رسول، بابو شیو ناتھ پرشاد، ساغر انصاری، شوکت مجید، احمد مکرم ہاشمی، محمد یوسف، محمد ادریس، پروفیسر عبد البارئ، آفتاب احمد، محمد نذیر بنارسی، ہوم صاحب، آغا رشید منظر، محمد الیاس اور جوہر صدیقی۔

کمیٹی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اور ممبران کو شامل کر سکتی ہے۔

بمبئی

انجمن ترقی اردو (شاخ بمبئی) نے بمبئی کے اردو نواز احباب کی ایک بہت بڑی نفسیاتی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ عام طور پر مشاعروں میں یہ ہوتا آیا ہے کہ منتظمین مشاعرہ نے شعرا کی ایک طویل فہرست مرتب کرلی اور مشاعرہ میں چار پانچ شعر سنانے کی قید لگا دی۔ چنانچہ نہ سامعین کی تسکین ہوتی ہے اور نہ ہی شاعر اپنے کلام کا وہ حصہ پوری طرح سے سنا سکتے ہیں جسے وہ سنانے کے قابل تصور کرتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو شاخ بمبئی کے زیر اہتمام مخصوص نشستوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے جس کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ صرف ایک شاعر کو مدعو کیا جاتا ہے اور اس سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ایک مختصر تقریر اپنی شاعری اور اپنی زندگی سے متعلق کریں۔ اور بعد میں اپنا کلام سنائیں۔ نشست ٹھیک سات بجے شام شروع ہوجاتی ہے اور ساڑھے آٹھ بجے ختم ہوجاتی ہے اس مدت میں شاعر اپنے وطن، اپنی تعلیم، شاعری کی ابتدا،

کن شعراء سے متاثر ہوئے اور اردو شاعری کے متعلق اپنے نظریہ کی بابت تقریر فرماتے ہیں اور بعد میں اپنی شاعری کے ابتدائی دور، درمیانی دور اور موجودہ دور کا کلام پیش کرتے ہیں۔

انجمن کی طرف سے شعرا کی خدمت میں نقدی یا تحفہ کی صورت میں نذرانہ پیش کیا جاتا ہے

اس دلچسپ سلسلے کی پہلی کڑی جناب شکیل بدایونی صاحب کے کلام اور تقریر کی نشست تھی جو یکم دسمبر ۱۹۵۶ء کو منعقد ہوئی۔

جناب علی سردار جعفری صاحب نے ۵۔ جنوری ۱۹۵۷ء کو اپنا کلام سنایا۔

تیسری نشست میں جگر مرادآبادی صاحب ۹۔ فروری کو اپنا کلام پیش کریں گے۔

ادبی نشستوں کا یہ سلسلہ بمبئی کے ارباب ذوق میں بہت پسند کیا جارہا ہے اور مصارف کے لئے عطیات فراخدلی سے دئے جارہے ہیں۔

انبالہ (پنجاب)

مالک رام پرکاش صاحب آنند جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو پنجاب اطلاع دیتے ہیں کہ

انجمن ترقی اردو پنجاب کا ایک اہم جلسہ جناب اے بی ایمل کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جس میں سب سے پہلے انجمن ترقی اردو پنجاب کے جنرل سکریٹری ملک رام پرکاش آنند نے اردو کانفرنس سب کمیٹی کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے ممبروں سے درخواست کی کہ وہ پوری دلچسپی کے ساتھ انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لیں۔ اس جلسے میں طے پایا کہ اپریل کے مہینے میں اردو کانفرنس کی جائے جس کی تاریخوں کا اعلان جلد کر دیا جائے گا۔

جناب کرشن لال شرما نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا کہ انجمن کا ایک وفد حکومت پنجاب سے ملے اور اپنی شکایات پیش کرے۔ اس سلسلے کی رپورٹ تیار کرنے کے لئے پروفیسر ضیا پروفیسر آزاد اور اے۔ بی۔ ایمل پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی گئی

ملک رام پرکاش آنند جنرل سکریٹری نے جن سنگھ کے الیکشن مینی فسٹو کے اس حصے کے خلاف ایک تجویز پیش کی جس میں جن سنگھ نے اعلان کیا ہے کہ اردو ایک فرقہ پرست زبان ہے اور اس زبان کے ہوتے ہوئے ملک میں فرقہ پرستی کو تقویت پہنچتی ہے اور جب بھی ہمارے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آئے گی ہم اس زبان کو بالکل ختم کردیں گے۔

اس تجویز میں مانگ کی گئی ہے کہ جن سنگھ یہ الفاظ اپنے مینی فیسٹو سے خارج کردے ورنہ انجمن اپنے حقوق کی حفاظت کے پیش نظر کوئی قدم اٹھانے پر مجبور ہوگی۔

اس قرارداد کے منظور ہونے کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

غزل

دیدۂ تر نے عجب جلوہ گری دیکھی ہے
غم نے جس شاخ کو پالا وہ ہری دیکھی ہے

ہائے کس بت کی خدائی کا بھرم لوٹا ہے
خلق نے آج ان آنکھوں میں تری دیکھی ہے

نہ ملا پر نہ ملا عشق کو اندازِ جنوں
ہم نے مجنوں کی بھی آشفتہ سری دیکھی ہے

آب و گل، انجم و گل، شمس و قمر، دیدہ و دل
کن جالوں میں تری پردہ دری دیکھی ہے

ہاں کبھی کھل نہ سکا پھول پہ مضمون بہار
اے صبا ہم نے تری نامہ بری دیکھی ہے

انور معظم

بقیہ مراسلات

بہت نازک بحث ہے۔ میں عتیق حنفی صاحب کو اس بحث کے لئے مستحق مبارکباد سمجھتا ہوں ضرورت ہے کہ مراسلہ کے دائرہ سے نکل کر یہ موضوع ایک گرانقدر مقالے کا عنوان بنے۔

آخر نامہ میں بہار و مغربی بنگال کی طرف مزید توجہ کی ضرورت ہے تحریک علاقائی زبان کے سلسلہ میں جو محضر نامہ ریاست بہار نے صدر جمہوریہ کے نام پیش کیا ہے اس کے اہم نکات شائع کریں اس یادداشت میں ریاست بہار میں اردو کے متعلق قیمتی اعداد و شمار دیئے گئے ہیں

اردو کی تعلیم جدید سے متعلق رسالہ شاعر بمبئی کی یہ رائے مناسب ہے کہ مرکزی انجمن ترقی اردو ایک اردو کمیشن مقرر کرے، جو تمام صوبوں، ضلعوں، شہروں اور قصبوں کا دورہ کرے اور اس کے لئے ہر صوبہ میں تین ادیبوں کا وفد مقامی ریاستی انجمنوں کے زیر اہتمام بنایا جائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ اداریہ میں خاص کر کے اس نکتہ پر ضرور اظہار خیال کریں گے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے بھی راجپوتانہ اور سی پی وغیرہ میں اس طرح کا کام کیا تھا جو جائزہ زبان اردو کے نام سے طبع ہوا تھا اس میں اردو کے متعلق اچھی اور کارآمد معلومات موجود ہیں

شاہ مقبول احمد لکچرار
سنٹرل کلکتہ، کالج کلکتہ۔

اردو دنیا

اردو اور اسلام

حیدرآباد، ۴ جنوری - آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ مسٹر ایس گوپالا ریڈی نے آج ان لوگوں کی سخت مذمت کی - جو اردو کا ناتا مذہب اسلام یا مسلمانوں سے جوڑتے ہیں۔

تیسرے سالانہ انٹر کالجیٹ اردو فیسٹیول کا افتتاح کرتے ہوئے مسٹر گوپالا ریڈی نے کہا کہ اردو سو فیصدی ہندوستانی زبان ہے جو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی اور ہندوستانی کلچر کا ہی ایک اہم حصہ ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس کو اس ملک کے لاکھوں عوام بولتے ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔

انھوں نے کہا کہ اردو مسلمانوں کی زبان نہیں ہے نہ تو یہ مشرق وسطیٰ میں بولی جاتی ہے اور نہ مکہ میں اس کا رواج ہے۔

مسٹر ریڈی نے کہا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص جو مسلمان ہے اردو ہی بولتا ہو۔ کیرالا، مدراس اور بنگال میں مسلمان ان علاقوں کی زبان بولتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ لوگ غیر مسلم ہیں۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں بنگالی سرکاری اور مادری زبان ہے۔ مگر اس کا بھی کوئی یہ مطلب نہیں نکال سکتا کہ وہاں لوگ غیر مسلم ہیں۔

مسٹر گوپالا ریڈی نے ہندی کو سنسکرت آمیز بنائے جانے کی روش کی سخت مذمت کی اور ہندی اور اردو کو ایک دوسرے سے قریب لائے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندی اور اردو ایک ہی زبان ہیں صرف رسم خط بدلا ہوا ہے۔

مسٹر گوپالا ریڈی نے جو آندھرا یونیورسٹی کے پرو چانسلر بھی ہیں۔ یہ تجویز رکھی کہ نصابی کتب دیوناگری اور عربی دونوں طرح کے رسم خط میں شائع ہونی چاہئیں۔

انھوں نے خطرہ ظاہر کیا کہ اگر ٹھوس اقدامات نہیں کئے گئے تو اردو ہندوستان سے مٹ جائے گی۔

مسٹر گوپالا ریڈی نے کہا کہ ریاستوں کی نئی حد بندی کے بعد یہ امید پیدا ہو گئی ہے کہ علاقائی زبانوں کو سرکاری طور پر زیادہ سرپرستی مل سکے۔

انھوں نے کہا کہ موجودہ رفتار سے اردو اگلے پچاس سال کے اندر مر جائے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ زبان جس کے پاس زبردست ادبی میراث اور سرمایہ ہے ہمیشہ ہمیشہ ہندوستان میں زندہ رہے اس کے لئے ہندی اور اردو کو قریب لانے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اردو بھی عوام میں باقی اور مقبول رہے۔

آخر میں مسٹر ریڈی نے کہا کہ یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہوگی کہ ہندوستان میں جہاں اردو نے جنم لیا ہم اردو سے غفلت برتیں اور پاکستان میں اس کو سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔

مسٹر نہرو نے اقبال کا شعر پڑھا

لکشمی بائی نگر، ۴ جنوری

مسٹر نہرو نے اقبال کی مشہور اردو نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا ایک شعر اس وقت پڑھا جب آپ اپنی تقریر میں ہندوستانی عوام کی ترقی کے مختلف ادوار کا ذکر کر رہے تھے۔

مسٹر نہرو نے جو کانگریس کا انتخابی منشور پیش کر رہے تھے تالیوں کی گونج میں اقبال کا یہ شعر پڑھا۔

اے آب رود گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

اردو کو فوراً قومی زبان قرار دیا جائے

لاہور ریڈیو ٹیلیگ: پاکستان اورئینٹل کانفرنس نے جس کا اجلاس کل ختم ہو گیا کوئی دو درجن قرار دادیں پاس کی ہیں جن میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ اردو کو فوراً قومی زبان قرار دے کر اسے سرکاری دفاتر میں رائج کیا جائے اور ذریعہ تعلیم بنایا جائے اردو صحافت کی تعلیم کا مرکز قائم کیا جائے۔ طب یونانی کی تعلیم کے لئے بہتر سہولتیں دے کر اسے تسلیم کیا جائے کانفرنس نے مولانا ظفر علی خاں کے انتقال پر ایک تعزیتی قرارداد بھی پاس کی۔

حکومت ہند عنقریب اردو کو دہلی کی علاقائی زبان تسلیم کرے گی

دہلی۔ ۳۰ جنوری۔ آج شری گوپی ناتھ امن نے انکشاف کیا کہ دہلی اسٹیٹ گورنمنٹ نے لسانی کمیٹی سے سفارش کی ہے کہ اردو اور ہندی کو علاقائی زبان تسلیم کیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ مرکزی حکومت جلد اس سفارش کو قبول کرے گی۔ انھوں نے فرمایا کہ فرقہ وارانہ طریقہ کار کا نتیجہ یہ ہے کہ پنجاب کو اردو میں پاکستانی زبان سمجھا گیا۔ حالانکہ پنجابی اردو جانتے ہیں۔ اور اردو آئین کی چودہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ لیکن مردم شماری میں اردو زبان کے بجائے ہندی زبان کو مادری زبان بتایا۔ شری امن نے بتایا کہ ہندی ہندستان کی قومی زبان ہے اور زبان کو کسی پر تھوپنا نہیں چاہئے بلکہ اس طرح سے مقبول بنایا جائے کہ لوگ اسے اپنے آپ اپنالیں۔ آپ نے اردو ہندی کے جھگڑے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ اردو زبان غیر ملکی زبان ہے وہ غلط کہتے ہیں۔ آپ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ انگریزی کو ہندستان سے نکالنا سخت غلطی ہے۔ انگریزی کے مقابلے میں ہندستان کی کوئی زبان ترقی یافتہ نہیں ہے۔ ٹیکنیکل علم کے لئے ہمیں انگریزی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

آچاریہ ونوبھاوے نے بھی انگریزی کو برقرار رکھنے پر زور دیا ہے۔

روس میں اردو ادب

ماسکو (تاس) گزشتہ سال کے آخر میں کرشن چندر سوویت یونین آئے تھے۔ اور ماسکو کے ریلوے مزدوروں کی پڑھنے والی کانفرنس نے انھیں دعوت دی جس میں ان ہی کی تصنیفات پر بحث ہونے والی تھی۔ ہر ادیب اور شاعر کو یہ سن کر خوشی ہوئی۔ کہ لوگ اس کے نام سے واقف ہیں اور بہت سے لوگ اس کی تصنیفات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ مزدوروں نے جب بیان کرنا شروع کیا کہ ان کی حقیقت پسندانہ کہانیاں پڑھ کر جن میں عام انسان سے محبت کا جذبہ کارفرما ہے۔ ان کے دل و دماغ پر کیا اثر پڑا۔ کرشن چندر کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ مقرروں نے کہا سوویت عوام کرشن چندر کی تخلیقات سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہماری دلی خواہش ہے کہ آپ کو اس مقدس فریضے میں اور بھی کامیابی نصیب ہو۔

کرشن چندر نے جو کچھ سنا اس سے وہ بہت متاثر ہوئے اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید میری تصنیفات ہندستان سے زیادہ سوویت یونین میں مقبول ہیں ظاہر ہے انھوں نے مبالغہ سے کام لیا اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں احساس ہے کہ سوویت عوام اردو ادب کی بہت قدر کرتے ہیں اس زبان کے ممتاز ادیبوں سے واقف ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں۔

آج کے لکھنے والوں میں کرشن چندر وہ پہلے ادیب ہیں جن کی تصنیفات سے سوویت عوام اچھی طرح واقف ہوئے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ ان کی کہانیاں یکے بعد دیگرے سوویت رسالوں "اوگنیوک" "اسمینا" اور "نوائے میر" میں آج سے پانچ سات برس پہلے شائع ہونا شروع ہوئیں۔ اپنی کہانیوں میں کرشن چندر محنت کش انسانوں، کسانوں، معمولی کلرکوں اور غریبوں کی زندگی ان کی جدوجہد اور امیدوں اور خواہشوں کو بڑی ہمدردی اور پیار سے بیان کرتے ہیں سوویت قارئین کو کرشن چندر کی یہ کہانیاں خاص طور پر پسند ہیں۔ "پورے چاند کی رات" "میں انتظار کروں گا" اور "کالو بھنگی" ان کا ناول "جب کھیت جاگے" بہت مقبول ہے جو سوویت یونین میں تین بار شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۵۵ء میں بیرونی زبانوں کے اشاعت گھر نے اس مشہور ناول نگار کی تخلیقات کو اور بھی مناسب طریقے سے پیش کرنے کی پہلی کوشش کی اور "منتخب تصانیف" کے عنوان سے ان کی کہانیوں کا مجموعہ شائع کیا جسے بہت پسند کیا گیا۔ کہانی اور شاعری کا ریاستی اشاعت گھر آج کل کرشن چندر کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ تیار کر رہا ہے اور بیرونی زبانوں کے اشاعت گھر میں ان کا ناول "شکست" شائع ہوا ہے۔

اردو اور ہندی کے مشہور ادیب پریم چند کے نام سے سوویت یونین کے لوگ بخوبی واقف ہیں ۱۹۵۵ء میں ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "ٹھاکر کا کنواں" کے نام سے شائع ہوا اور ۱۹۵۲ء میں ان کا ناول "گئو دان" روسی زبان میں شائع ہوا۔ آج کل ان کی بہت سی کہانیوں اور ناولوں کا ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں پہلی بار کوشش کی گئی کہ ہندستان کے اردو ادیبوں کی منتخب تصانیف کا ایک مجموعہ شائع کیا جائے۔ اس مجموعے نے جس کا عنوان ہے "ہندستان اور پاکستان کی مختصر کہانیاں" سوویت قارئین کو خواجہ احمد عباس، ابراہیم جلیس، صالحہ بیگم، مہندر ناتھ، جعفری اور احمد ندیم قاسمی جیسے اردو نثاروں سے روشناس کرایا۔ حال ہی میں عظیم شاعر اقبال کی کئی نظموں کا ترجمہ شائع ہوا اور سردار جعفری کی طویل نظم "ایشیا جاگ اٹھا" بھی شائع ہوئی ہے۔

آئندہ چند سالوں میں اردو کی بہت سی کتابوں کے ترجمے شائع ہوں گے جن میں شاعری کے مجموعے بھی ہوں گے۔

لندن سے ایک خط

محبی! آپ کو مدت سے خط لکھنے کے ارادہ میں ہوں اور اب داستان اتنی لمبی ہو گئی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کہاں سے شروع کروں اور شروع کروں تو بپایاں کو رساندم؟ میں ایران، شام ترکی، یونان اور اطالیہ میں ٹھہرتا ہوا یہاں آیا ہوں۔ ان جگہوں کے قیام نے ایک MENTAL LANDSCAPE فراہم کردیا ہے اس بڑے مرقع میں ہندستانی تہذیب کے خدوخال اور بھی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ وکٹوریہ برٹش میوزیم اور انڈیا ہاؤس میں بڑا ذخیرہ ہے اور اس پر کامل عبور حاصل کرنے کے لئے ایک عمر چاہئے بہرحال لگا ہوا ہوں اور اپنے خدا سے مایوس نہیں ہوں۔ سماجی زندگی کا کام مشکل ہے لیکن بڑا ہی دلچسپ۔ بقول شخصے MORE POETICAL THAN ALL SHELLEY AND MORE ROMANTIC THAN ALL SCOTT. مشکل اس اعتبار سے کہ وہ اقتصادی اور سیاسی تاریخ کی درمیانی کڑی ہے سیاسی تبدیلیاں تو سطح پر نظر آجاتی ہیں لیکن سماجی زندگی کا دھارا بہت آہستہ آہستہ نیچے نیچے بہتا ہے۔

یہاں پٹرول کی نایابی نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ ایک ایک قطرے کا حساب غالب کے خونِ جگر سے زیادہ سخت ہو رہا ہے۔ گرانی بڑھتی جاتی ہے۔ اور اسی رفتار سے فلک سے طیش رفتہ کا تقاضا اور شکایت بھی!

دلی کے جلسوں کا حال یونسکو کے ترجمان مسٹر پلے سے معلوم ہوا انھوں نے نئی دلی میں تقریر کی اور تصویریں دکھائیں مجھے اس جلسہ کی صدارت کرنا پڑی آپ کو معلوم ہے کہ میں ان ایام دلبالی کا آدمی نہیں۔ بالکل اس پہلوان کا سا حال تھا جو ایک مرتبہ منبر پر آگیا تھا! لیکن شام کے اخبارات کہتے ہیں کہ دونوں تقریریں بڑی شگفتہ اور معقول تھیں! یہاں کے پریس ٹرسٹ میں بھی چھ سات دفعہ شرکت کی ایک سیمینار جو METHODOLOGY OF RESEARCH پر تھا اس میں بھی شامل ہوا اس میں خاص طور پر MATERIAL واقعات کا قطب مینار کھڑا کر دینے کو STATISTICS منع کیا گیا۔ اور کہا گیا کہ واقعات اہم ہیں لیکن ان سے بھی زیادہ اہم واقعات کا باہمی رشتہ ہے۔ بے اختیار آپ کی بعض تحریریں یاد آگئیں۔ اس لئے کہ وہ واقعات کی کھتونی نہیں، ان کا امتیازی وصف یہی ہے کہ ان میں ان باہمی رشتوں پر زور دیا گیا ہے۔ گویا لکھنے والے کی حیثیت راوی کی یا تحقیق کرنے والے کی حیثیت گورکن DIGGER کی نہیں۔ پندرہ دن ان ہی موضوعات پر بحثیں رہیں۔ اچھے لوگ جمع تھے۔

یہاں کے تھیٹر بہت پسند آئے۔ ابھی ایک کھیل دیکھا A VIEW FROM THE BRIDGE یہ ممنوعہ کھیل ہے صرف ممبر دیکھ سکتے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ ایک سن رسیدہ شخص ایک لڑکی کو پالتا ہے لیکن اس سے جنسی محبت کرنے لگتا ہے (یہ جزو قابلِ اعتراض نہیں) ایک اطالوی نوجوان اس گھر میں مہمان آتا ہے اور وہ اس لڑکی سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اس معمر آدمی کو یہ بات ناگوار معلوم ہوتی ہے اور وہ اس نوجوان کو ذلیل کرنے کے لئے ایک موقع پر اس کو پیار کرلیتا ہے (یہ ٹکڑا قابلِ اعتراض ہے) ایک خاتون میرے قریب بیٹھی تھیں۔ میں نے پوچھا اس میں اعتراض کی ایسی کیا بات ہے۔ یہ میرے دوست (اشارہ بیوی) بیٹھے ہیں میں ہندستان اور CONTINENT کے بعض ملکوں کے رسم و رواج کے مطابق ان کو پیار کرسکتا ہوں۔ اس میں کوئی اعتراض کی بات تو نہیں "کہنے لگیں" اگر آپ ان کو پیار کریں گے تو لارڈ چیمبرلین کے سپاہی آپ کو گرفتار کریں گے اور مجھ سے کہیں گے تو سب آپ کے حسن انتخاب کی داد دیں گے"۔

انگلستان غریب ہوگیا ہے۔ یہ غربت ایسی ہے کہ میں اسے چکھ سکتا ہوں، چھو سکتا ہوں، عام آدمی "کل" کی دنیا میں رہتا ہے۔ لیکن پڑھے لکھے لوگوں میں بڑی توانائی ہے اور وہ نئی زندگی شروع کرنے کے آرزومند ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ لوگ کم آمیز ہیں لیکن جب ملتے ہیں تو اس طرح کہ سارا وقار گلہ ڈھل جاتا ہے یہاں کے اہل علم کی شفقتوں کو میں نہیں بھول سکتا۔

اردو کے ریکارڈ (خاص طور پر آوارہ اور دو بیگھے زمین کے) میں نے بغداد، دمشق، بیروت، استنبول اور لندن میں سنے نہایت مقبول ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی

مراسلات

اور غالب پیدا ہوں اور اردو کی
مشکلات پر غالب آئیں

محترمی! تسلیم!

بندہ مندرجہ بالا کے زیر اہتمام رکھے گئے مذاکرہ کے حالات قلم بند کر کے بھیج رہا ہے بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ اپنے ہفتہ وار پرچے "ہماری زبان" میں چھاپ کر مشکور فرمائیں۔

دیجے کالج بیجاپور میں بزم اردو کی طرف سے مرزا غالب پر ۲۰-۲۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کو ایک شاندار مذاکرہ رکھا گیا تھا جس کی صدارت جناب شمری دھر چھترے نائب صدر انجمن ترقی اردو ہند شاخ بیجاپور نے انجام دی۔ مذاکرہ کا آغاز مرزا غالب کی چند غزلوں سے ہوا۔ اس کے بعد طلبا نے مرزا غالب کی شخصیت، شاعری و ادبی مرتبہ سے تعلق رکھنے والے مختلف موضوعات پر تقاریر کیں۔ آخر میں صدارتی تقریر میں جناب چھترے صاحب نے مرزا کے متعدد اشعار کا مطلب مختلف پیراؤں میں بتا کر طلبا کے ادبی ذوق میں اضافہ کیا اور اپنی تقریر کے دوران میں یہ بھی فرمایا کہ اردو جن مشکلات کے دور میں آج گزر رہی ہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اور بھی بہت سے غالب پھر سے پیدا ہوں تاکہ وہ اردو کی مشکلات پر غالب آجائیں۔

(مخلص) محبوب خاں قزاقی
سکریٹری بزم اردو۔ دیجے کالج بیجاپور

ارباب اردو زندہ ہیں

مکرمی۔ تسلیم!

اخبار ہماری زبان اپنے روز اول ہی سے میرے مطالعے میں ہے۔ اس کی اشاعت و ادارت میں جو کچھ تغیر و تبدل اور نشیب و فراز ہوئے ہیں وہ سب میری آنکھوں کے سامنے ہیں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ انتظام سے اخبار کی دلچسپیوں میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ خصوصاً اس کا ہفتہ وار ہو جانا بڑی خوشگوار تبدیلی ہے۔ اب یہ اخبار ایک طرف قاری کے سامنے دنیائے اردو کی ہر سمت کی خبریں پے بہ پے پیش کر رہا ہے۔ اور دوسری جانب اس امر کا ثبوت بھی ہے کہ ارباب اردو زندہ ہیں اور جدوجہد میں سست گام نہیں۔

اداریہ کے صفحات میں اردو کے مسئلہ کو جس طرح پیش کیا جا رہا ہے وہ نہ

وسط ایشیا کے ادیبوں کی علی گڑھ میں آمد

علی گڑھ ۹۔ جنوری کو مرزا ترسون زادہ تاجکستان کے مشہور فارسی شاعر، مہدی حسین ترکمانی شاعر اور قراسید آذربائیجان کے مصنف مع ایک ترجمان کے علی گڑھ تشریف لائے۔ انھوں نے وائس چانسلر کے یہاں لنچ تناول کیا۔ اس کے بعد یونیورسٹی لائبریری اور انجمن ترقی اردو ہند کے صدر دفتر میں تشریف لے گئے۔ سکریٹری نے انجمن کی کچھ جدید مطبوعات وفد کی نذر کیں جس پر انھوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ یونین کی طرف سے ۴ بجے ان کا خیر مقدم کیا گیا اور ۵ بجے شام کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے چائے کی دعوت ہوئی۔ مرزا ترسون زادہ صدر وفد نے تقریر کی اور وسط ایشیا اور ہندستان کے تہذیبی رشتوں پر زور دیا۔ انھوں نے یونیورسٹی کو اپنے ملک کے بنے ہوئے چند خوبصورت تحفے بھی پیش کئے۔ وفد کے ساتھ جو ترجمان تھی وہ نہایت صاف اردو بولتی تھی اور جدید اردو ادب کے بیشتر کارناموں سے واقف تھی۔

جگر صاحب علی گڑھ میں

چند روز ہوئے حضرت جگر مرادآبادی علی گڑھ تشریف لائے اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے یہاں قیام فرمایا۔ جگر صاحب کے کلام کا جو انتخاب انجمن سے شائع ہو رہا ہے اس کے متعلق سکریٹری صاحب سے گفتگو ہوئی۔ ہمیں اس اعلان میں بڑی مسرت ہے کہ جگر صاحب نے انجمن کے کاموں میں پوری مدد دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ان کے نئے مجموعے "آتش گل" کے ہندستانی ایڈیشن کی طباعت کے بھی انتظامات ہو رہے ہیں۔

٭ نہ صرف اقتضائے وقت کے مطابق ہے بلکہ میرے خیال میں یہی طریقہ کار بھی بجا ہے۔ جذبات کی بے پایہ شدت اور طغیانی کے بجائے سنجیدگی، توازن اور اعتدال کی مہریں ہر سطر پر لگی ہوتی ہیں۔ عنوانات۔ اردو دنیا، انجمن کی خبریں، تبصرے اور معاصرین۔ سبھی خیال انگیز اور بصیرت افروز ہیں۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل گزارش ہے کہ اختصار سے کام نہ لیا۔ کسی شہر اور مقام کی ادبی سرگرمیوں کی روداد میں وہاں کی سماجی اور تمدنی زندگی کی تفصیلات درج ہوتی ہیں جو مفید معلومات ہیں۔

ادھر کئی خطبات صدارت بالاقساط شائع ہوئے ہیں جو قیمتی مسودہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خصوصاً مندرجات کے معیار اور حضرات صدر کے ناموں سے آگاہی کے بعد مسرت دوگونہ ہو جاتی ہے۔ اور گمان ہی نہیں یقین ہوتا ہے کہ اردو دائمی سرمایۂ مشترک ہے۔

تازہ ترین اشاعت (۲۲-۲۳ دسمبر ۱۹۶۹ء) میں "اردو شاعروں اور ادیبوں" کے زیر عنوان جو خیالات تحریر میں آئے ہیں ان سے مجھے حرفاً بحرفاً اتفاق ہے مقامی ماحول، آفاقیت، انسانیت، اور ہندستانیت،

(بقیہ ص ۱۲)

معاصرین

ادب پر سیاست کا غلبہ

اس ہفتہ دہلی میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس ہوئی جس میں اس مسئلہ پر زور دیا گیا کہ ادب اور لٹریچر پر سیاست کا غلبہ نہ ہونا چاہئے اور کسی کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ وہ ایک ادیب کو یہ حکم دے کہ اسے کیا لکھنا ہے اور کس طرح لکھنا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ادب۔ سرمایہ داری اور سیاست کے غلبہ سے آزاد ہو سکتا ہے۔ اگر ادیب کا پیٹ خالی ہو اور یہ معاش سے بے فکر نہ ہو کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ آج نہیں آج سے سینکڑوں اور ہزارہا برس پہلے بھی مصنفین اور شعرا نے بادشاہوں کی تعریف میں قصیدے لکھے۔ غالب کے خطوط سے ظاہر ہے کہ آپ بادشاہ وقت کی تعریف کرنے کے لئے مجبور تھے اور جب بادشاہ معتوب ہوا تو آپ کو انگریز حکام کی مدداری کرنی پڑی۔ ڈاکٹر اقبال نے اپنی تصانیف ریاستوں کے فرمانروا کے نام ڈیڈی کیٹ کیں۔ مسٹر حفیظ جالندھری نے جنگ کے زمانے میں انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے "میں چھورے کو بھرتی کرا آئی آں" جیسے غلامانہ ذہنیت کے گیت لکھے اور حضرت جوش کو تو اس زندگی میں نہیں اُن کی روح کو دوسری دنیا میں بھی افسوس ہوگا کہ آپ نے "جو تیوا" جیسے گھٹیا گیت لکھے جن کی جوش جیسے ایک بلند ترین شاعر انقلاب سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی اور آج بھی اگر تحقیقات کی جائے تو ہندوستان میں درجنوں نہیں سینکڑوں ادیب ایسے ملیں گے جو امریکہ کے حق میں پراپگنڈہ کرنے میں مصروف ہیں کیونکہ بازار میں تو ان کے مضامین کی قیمت شاید ایک روپیہ صفحہ ہو مگر امریکن پراپگنڈا کرانے والے ان کو پانچ پانچ اور دس دس روپیہ صفحہ دیتے ہیں۔

ادب اور لٹریچر کو سیاست یا سرمایہ داری کے غلبہ سے نجات دینے کی صورت صرف ایک ہی ہے کہ ادیبوں شعراء اور مصنفین کو مالی مشکلات سے نجات دی جائے تاکہ یہ لوگ فکر معاش سے بے نیاز ہو کر وہ کچھ لکھیں جو وہ چاہتے ہوں اور ان کا ذہن سیاست حکومت یا سرمایہ داری سے مغلوب نہ ہو۔ ورنہ اگر ان کی مالی پریشانیاں قائم رہیں تو ادب اور لٹریچر سرمایہ کے ہاتھوں فروخت ہوتا ہی چلا جائے گا۔ ادب فروشی کو کوئی روک نہیں سکتا۔

(ریاست دہلی)

اردو میری زندگی ٹھہری.....

(کاروانِ ادب بمبئی)

میں نے اردو کو نئے الفاظ اور نئی تشبیہات اور نئے استعارے دئے ہیں۔ میرا دل اتنا کچھ کرنے اور کہنے پر مطمئن نہیں ہوا۔ چاہتا ہوں کہ اردو کے لئے وہ کچھ کر جاؤں جو اب تک کسی نے نہ کیا ہو شعر میری زندگی، اور اردو اس کا ذریعہ۔ اس طرح اردو میری زندگی ٹھہری۔ اور اپنی زندگی سے کسے محبت نہیں ہوتی۔

(فراق گورکھپوری)

ہماری زبان

(کاروانِ ادب بمبئی)

تم کہتے ہو ہندوستان میں اردو کی قدر نہیں ہوگی یہ تمہارا وہم ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ اردو کا نام ہندوستانی یا ہندی رکھ دیا جائے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ لوگ اردو کی بجائے ہندی بولنا شروع کر دیں۔ اردو ایک زندہ زبان ہے اور اس میں اتنی تازگی اور رعنائی ہے کہ وہ ہر رقیب کو پچھاڑ سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے اب تک ہر رقیب کو چاروں شانوں چت نہیں گرایا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس کا وجود کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا۔ اگر ہندی زبان کے کروڑوں حامیوں کے باوجود اردو پھولتی اور پھلتی رہی ہے تو اس کا سبب اس کی برتری ہے۔ مجھے یقین ہے مذہبی جنون یا سیاسی مصلحتیں اردو کو نیست و نابود نہیں کر سکتیں، کیونکہ اردو مذہب اور سیاست سے بے نیاز اور بالاتر ہے۔ اردو مسلمانوں کی زبان ہے نہ ہندوؤں کی۔ یہ رندانِ بت پرست کی زبان ہے اور جب تک دنیا میں ایک بھی رند باقی ہے اردو کے جام پئے اور پلائے اور لنڈھائے جائیں گے۔ عنقریب ہندوستان اور پاکستان کو اردو کی ضرورت پڑے گی۔ اگر ان دونوں ممالک کو شریف ہمسایوں کی طرح رہنا ہے تو انہیں اردو کو مشترک ذریعہ اظہار بنانا ہوگا۔

(کنہیا لال کپور)

تبصرے

خرام

مصنف :- بیش چند نقش
ناشر :- مکتبہ تعمیر اردو - دہلی
قیمت :- دو روپے آٹھ آنے

بیش چند نقش ایک نوجوان اور شاعر ہیں ۔ ان کا کلام رسالوں میں بہت کم شائع ہوا ہے ۔ دلی کے قیام کے باوجود دلی کے کسی مشاعرے میں بھی ان کی صورت نہیں دیکھی گئی ۔ یہ ضبط توازن اور انداز بے نیازی نقش کی فنکارانہ شخصیت کو بہت دلکش بنا دیتا ہے اور یہ دیکھ کر ہمیں اور بھی مسرت ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں صرف انھیں موضوعات کو برتنے کی کوشش کی ہے جو ان کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں ۔ شہرت کی ہوس میں انھوں نے بازار کے چلتے ہوئے سکوں کی پروا نہیں کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا مجموعہ حشو و زوائد سے پاک ، خوبصورت شاعری کا نمونہ ہے اور ہر جگہ سلیقے اور نفاست کا پتہ چلتا ہے ۔ نقش نے ابھی تک غزل اور قطعہ کو آزمایا ہے لیکن دونوں اصناف میں انھوں نے فن کے آداب کا خیال رکھا ہے ۔ ان کے کلام میں کچھ نئی خوشبوئیں اور نئے رس بھی ہیں اور قدم قدم پر تازگی کا احساس ہوتا ہے ۔

کچھ ہیں وہ تین رسیلے — مرنے والے اور بھی جی لے
کچھ ہمارے صدیوں کے ترشے ہوئے اصنام — سوتا ہے کلاکار کلا جاگ رہی ہے
مدھ میں ڈوبی کلی کی آنکھ کھلی — صبح انگڑائی لے کے جاگ اٹھی

دنیائے زندگی کی خوشبوؤں میں بسنے والی
اکثر ہوائے غم نے گیسو ترے سنوارے

" ابتدائیہ " فراق گورکھپوری نے لکھا ہے ۔ لکھتے ہیں " خرام بہت خوبصورت لفظ ہے ۔ اور اس میں صوتی لحاظ سے ایک غنائیت ہے ۔ اور معنوی لحاظ سے وجدان کو متاثر کرنے کی صفت ۔ شاعر کی خوش سلیقگی کا یہ نام ضامن ہے " یہ ایک فقرہ نقش کے کلام پر بڑی اچھی تنقید ہے ۔ کتاب کے نام ہی کی طرح اس کی طباعت بھی بے حد حسین ہے ۔ اور مکتبہ تعمیر اردو اس کی اشاعت پر مبارکباد کا مستحق ہے ۔ جابجا محمد اسمٰعیل (آرٹسٹ) کی نقش گری کے نمونے بھی ہیں جو بہت دلپذیر ہیں ۔

لہو ترنگ

مصنف :- سید ضمیر جعفری
ناشر :- مکتبہ کارواں ۔ ایبک روڈ ۔ انارکلی ۔ لاہور
قیمت :- دو روپے

سید ضمیر جعفری صاحب پاکستان کے ایک فوجی افسر ہیں ان کی نظموں میں حب الوطنی اور سپاہیانہ جاں نثاری کا عنصر بہت نمایاں ہے نظموں کے عنوانات سے ان کے موضوع کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے ۔

" اے وطن جان من " " پاکستان ہمارا " " پاکستانی جوانوں کو سلام " " قائد اعظم " " بڑھے چلو " " ملٹری اکیڈمی میں " " گرم خون دوستو " " ہم پرچم بردار تھے "

پیش لفظ جسٹس (ریٹائرڈ) ۔ ایس ۔ اے رحمان نے لکھا ہے ۔ فرماتے ہیں " آج کل کا اردو ادب الا ماشاء اللہ قنوطیت کا صحرا ہے لیکن ضمیر جعفری نے خلوص ، امید اور یقین کی ہمنوائی کی ہے جو عوامل حیات میں اہم مرتبہ رکھتے ہیں "

جزیروں کے گیت

مصنف :- سید ضمیر جعفری
ناشر :- مکتبہ کارواں ۔ لاہور
قیمت :- دو روپے

ضمیر جعفری صاحب نے فوجی ملازمت کے سلسلے میں اپنی عمر کا ایک حصہ ملایا اور سماٹرا وغیرہ کے جزیروں میں گزارا ہے ۔ اسی زمانے میں انھوں نے ان جزیروں کی ایک مخصوص صنف " پنتون " کو اردو لباس میں پیش کرنے کی کوشش کی ۔ پنتون پنجاب کے " ماہیا " اور سرحد کے " ٹپہ " سے ملتی جلتی سی چیز ہے ۔ جعفری صاحب نے ترجمہ بہت اچھا کیا ہے اور اس طرح ہماری زبان کے سرمائے میں خوبصورت اضافہ کیا ہے ۔ نمونے کے طور پر ایک " پنتون " کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے ۔

سو پالی کی جتاب چادر تلے چھپ کے بیٹھی ہیں یوں کونپلیں دھان کی ۔
جیسے میلان گر کی حسیں جھیل میں مدتوں کے حسیں راز سوئے ہوئے
جیسے جنگل کے نیلم میں پریوں کے دل سہمے سہمے ہوئے کھوئے کھوئے ہوئے
جیسے خوابوں میں تارے چمکتے ہوئے جیسے دل میں تمنائیں انسان کی

کتاب کے شروع میں چراغ حسن حسرت مرحوم کا لکھا ہوا دیباچہ شامل ہے ۔

ادیب کے سو شعر

مصنف :- لعل محمد خاں ادیب
ناشر :- کاشانۂ ادب کراچی
قیمت :- چار آنے

لعل محمد خاں ادیب کراچی کے ایک گمنام سپاہی ہیں ۔ فرصت کے اوقات میں انھوں نے شعر کی دیوی کی پوجا کی ہے اور اپنے اشعار کا ایک مختصر انتخاب بڑے انکسار کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ کلام پر اخلاقی رنگ غالب ہے اور ضرب الامثال اور محاورات کو نظم کرنے کا بھی شوق ہے ۔ بہت سے شعر انھوں نے اپنی زبان کی محبت میں سرشار ہو کر کہے ہیں ۔ جو ہر طرح قابل تعریف ہیں ۔

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

اہتمام ... پرنٹر پبلشر نے نیشنل پریس کمپنی میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا